مولانا عبید اللہ سندھی

برطانوی ہندوستان میں جن اصحاب عزیمت نے مذہب اور اخلاق کی بلند قدروں سے سرشار ہو کر برطانوی استعمار کے خلاف جہاد میں بھرپور حصہ لیا' ان میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ (وفات ۱۹۴۴ء) بھی ہیں۔ مولانا نے ایک سکھ گھرانے میں جنم لیا' قسمت نے یاوری کی' پہلے اسلام قبول کیا' پھر دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔ جہاں پر مولانا محمود حسن صاحبؒ جیسے عالم ربانی اور مجاہد حریت سے فیض حاصل کیا۔ پھر انہی کے ایماء پر ۱۹۱۵ء میں کابل چلے گئے' کابل سے ترکی اور روس بھی گئے۔ کابل' انقرہ' اور ماسکو میں مولانا مرحوم کئی سال تک بہت قریب سے سیاست کے سٹیج پر انقلابات زمانہ کا تماشہ دیکھتے رہے۔ مختلف قوموں کو ڈوبتے دیکھا' پرانے نظام سیاست کو ٹوٹتے اور نئے نظام کو برسراقتدار آتے دیکھا۔ سیاسی زندگی کے نشیب و فراز' عملی زندگی کے تلخ حقائق اور نئی قوموں کے طرز زندگی نے مولانا کی فکر و نظر کے سامنے ادراک حقیقت کی نئی نئی راہوں کو کھول دیا اور ان کے جیب و آستیں میں پنہاں وہم و گماں کے سارے بتوں کو جن کی بنا پر ابن خلدون نے علماء کو سیاست میں اجنبی قرار دیا تھا' پاش پاش کر دیا' جس کے نتیجہ میں مولنا نے اپنا فلسفہ سیاست از سرنو مرتب کیا جو

پرانے علم کلام کا رہین منت نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا کو جلا وطنی کی آزمائش سے واسطہ نہ پڑتا' تو ان کا یہ فلسفہ سیاست بھی وجود میں نہ آتا' یہ فلسفہ دراصل ان کی گہری سوچ' مذہب' فلسفہ' تصوف' تاریخ کے عمیق مطالعہ' عملی زندگی کے مشاہدات اور تلخ حقائق کا ترجمان ہے' مولانا جب ایک مدت کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں واپس وطن آئے تو شام ہو چکی تھی' اور ان کا سفینہ حیات ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا اس لیے مولانا اہل وطن کو اپنے افکار سے آگاہ کرنے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے مختلف مقامات پر علماء' طلبہ اور عوام کے اجتماعات سے خطاب کیا' حسن اتفاق سے مولانا کو مرحوم پروفیسر محمد سرور جیسا عقیدت مند اہل قلم بھی مل گیا' جس نے سلیقے سے مولانا کے افکار کو مرتب کیا۔ مولانا کے افکار کو علمی حلقوں میں سنجیدگی سے پڑھا گیا بعض حلقوں میں انہیں ناپسند بھی کیا گیا۔ ان حلقوں نے مولانا کے خیالات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے کہا کہ مولانا کی سوچ وطنیت اور قومیت کے دائروں میں بند ہو کر رہ گئی ہے' یا یہ کہ مولانا کی دعوت' ایک سطحی اور مرعوب ذہنیت کی دعوت ہے۔

مولانا سندھی کے خطبات' مقالات اور تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کی رائے میں:

۱۔ مسلمانوں کو اپنی مادی ترقی کے لیے مغرب کی صنعت اور جمہوریت سے فائدہ اٹھانا چاہیے' لیکن مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمیں سرمایہ داری نظام توڑ کر ایسا منصفانہ اور عادلانہ اقتصادی نظام قائم کرنا چاہیے' جو محنت کشوں کی فلاح کا ضامن ہو۔

۲۔ مسلمانوں کو اپنے فلسفیانہ ورثے پر عبور حاصل ہونا چاہیے' نیز یہ کہ دینی مدارس کو اپنے نصاب پر نظرثانی کرنی چاہیے۔

۳۔ برصغیر کی دو بڑی قوموں کو جنہوں نے صدیوں تک میدان سیاست میں اپنے جوہر دکھائے ہیں' ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے علمی بنیادوں پر کام کرنا چاہیے' وحدۃ الوجود یا وحدت ادیان کا تصور دونوں قوموں کی ذہنی ہم آھنگی کے لیے بنیاد بن سکتا ہے۔ مولانا نے اس سلسلے میں مزید کہا کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان بھی لسانی اور ثقافتی اختلافات موجود ہیں' جنہیں ایک نیا سیاسی نظام وضع کرتے وقت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ہے مولانا کے افکار کا خلاصہ' سوال یہ ہے کہ کیا آج ہم مغرب کی سائنسی تعلیم سے تغافل برت سکتے ہیں؟ اسی طرح کیا برصغیر کی دو بڑی قوموں کے لیے امن و آشتی سے رہنا ناممکن ہے؟ مولانا قیام امن کے لیے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد یا سمجھوتے کو ضروری جانتے ہیں' بلکہ عالم انسانیت کو جنگ کی خوفناک تباہیوں سے بچانے کے لیے پورے ایشیا کی فیڈریشن کے بھی قائل ہیں' ہرچند مولانا کے بعض سیاسی افکار ناقابل عمل تھے اور رومانوی سیاست کا نتیجہ' مثلاً افغانستان میں بیٹھ کر حکومت موقتہ' (برائے ہند) کا قیام' جس کے صدر راجہ مہندرا پرتاب تھے' (۱) لیکن عمومی طور پر یہ افکار گہری سوچ بچار کا نتیجہ تھے۔ جنہیں آج آسانی سے مسترد کرنا ممکن نہیں' مثلاً ہندو مسلم سیاسی مسئلے کے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: ڈاکٹر خالد حسن قادری: مولانا حسرت مولانی' دہلی' ۱۹۸۵ء)

مولانا کا پرامن حل پر اصرار، لیکن ہمارے عہد میں جن اصحاب ظواہر نے مولانا کے افکار پر اپنے مخصوص مذہبی تصورات کی روشنی میں تنقید کی ہے، وہ ہماری تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے، علمی مسائل کے بارے میں یہ موقف ہمیں قرون وسطی سے ورثہ میں ملا ہے، جب اصحاب ظواہر کی ایک جماعت وحی کے معنی و مطالب اور روح کا ادراک کرنے کی بجائے ظواہر پر زور دیتی تھی اور قرآن مجید کی بلند اور عالمگیر قدروں پر غور و فکر کی جگہ فقہی اور قانونی جزئیات پر اپنی توانائی صرف کرتی تھی اور اس حقیقت سے برابر تغافل برتتی رہی کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے نیز یہ کہ قانون آدمی کے لیے ہے، آدمی قانون کے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی جونہی ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے، پہلے دور کے رسم و رواج ماضی کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً غلامی قرون وسطی میں ہمارے معاشرے کا ایک قانونی حصہ تھی، لیکن آج مسلم معاشرے نے اسے قانونی طور پر ختم کر دیا ہے۔ ایسے ہی علم کلام کی کتابوں میں مسلم صدر حکومت کے لیے قریشی ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے، لیکن آج مسلم معاشرے نے اس تصور کو مسترد کر دیا ہے کیوں کہ مسلمانوں کا اجتماعی شعور اور ضمیر غلامی یا خاندانی امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسی قسم کے اور کئی مسائل ہیں جو ہماری اجتماعی اور قانونی زندگی میں ایک وقت تک اہم کردار ادا کر چکے ہیں لیکن آج ان کا ہماری اجتماعی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اصحاب ظواہر کا یہی موقف تھا، جس کے خلاف غزالی نے آواز اٹھائی، حنابلہ (علمائے ظاہر) سے بچنے کی تاکید کی، اور کہا:۔ قرآن مجید ں ظاہری تفسیر و تشریح میں جو کچھ

مروی ہے۔ وہ عقل کی انتہا نہیں ہے۔" عہد حاضر میں اصحاب ظواہر کے جان نشینوں نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں غیر ملکی غلامی کے خلاف برصغیر یا مسلم ممالک میں آزادی کی جو تحریکیں چلیں' اصحاب ظواہر نے مذہبی نقطہ نظر سے ان کی مخالفت کی اور ان تحریکوں کو "خدا کی حاکمیت" کا حریف قرار دیا' حالاں کہ حریت یا آزادی' قرآن مجید اور اسلامی افکار میں زندگی کی بنیادی قدر شمار ہوتی ہے' (الاصل فی الناس الحریۃ) اور خدا کی ذات گرامی آزادی کا بنیادی ماخذ اور سرچشمہ ہے۔

قرون وسطی کا یہی انداز فکر ہے جو دور حاضر میں مولانا سندھی اور دوسرے اصحاب عزیمت کی سیاسی سرگرمیوں کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے' کیوں کہ اس کی نظر قرآن کی بلند اخلاقی قدروں پر نہیں' بلکہ تاریخ کے ایک خاص عہد پر ہے' جس میں سیاسی اور اجتماعی زندگی ایک مخصوص طرز معاشرت رکھتی تھی۔

ہمیں مسرت ہے کہ ڈاکٹر غلام محمد جعفر نے مولانا سندھی کی ابتدائی زندگی پر جس سے ہماری نئی نسل آگاہ نہیں' قلم اٹھایا۔ جو اہل علم مولانا کے مذہبی اور سیاسی افکار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں انہیں سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب: "عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقدین" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(رشید احمد جالندھری)